اقبال اور رومی: عشق، خودی اور وجود کے مابین ایک تخلیقی و تنقیدی مکالمہ

IQBAL AND RUMI: A CREATIVE-CRITICAL DIALOGUE BETWEEN LOVE, SELFHOOD,AND BEING.

ڈاکٹر نیلم تاج* / ڈاکٹر محمد امتیاز**

Abstract:

This article offers a creative –re-reading of the intellectual and spiritual relationship between jalal al-Din Rumi and Muhammad Iqbal, moving beyond conventional influence –based or comparative frameworks.Rather then positioning Iqbal merely as a disciple or interpreter of Romi , the study argues that Iqbal engages with Rumi through a dynamic Philosophical dialogue – one that reconfigures classical sufi concepts such as love (ishq),unity of being, and spiritual annihilation in to an active, self-affirning vision of human existence.

By closely reading selected verses from Rumi's Mathnawi and Iqbal 's major poetic works –Particularly Asrar –e –khudi, Bal-e-jibril, and javid nama- this Article demonstrates how iqbal creatively transforms Rumi 's metaphysics of love in Rumi is primarily a mod e of ontological awakening whereas in Iqbal it becomes a force of ethical action and existential becoming .

Employing a creative – critical methodology ,the article situates this Dialogue within contemporary debates on spirituality ,subjectivity ,and the role of poetry in shaping human consciousness. It concludes that the Rumi – iqbal relationship is best under stood not as continuity or rupture , but as a productive tension through which a

* اسلامیہ کالج یونیورسٹی پشاور

** ایسوسی ایٹ پروفیسر، گورنمنٹ کالج آف مینجمنٹ سائنسز، نوشہرہ

new model of the " complete human being „ emerges – one that integrates spiritual depth with creative action.

Keywords: Rumi, Iqbal ,love,(ishq),selfhood (Khudi), Being, creative criticism, Sufism,urdu poetry.

کلیدی الفاظ: رومی، اقبال، تخلیق، فکر، صوفیانہ، تاریخ، خودی، مکالمہ، عشق الٰہی، سفر، شاعری وغیرہ۔

ہر دور کی عظیم فکر اپنی روحانی، فلسفیانہ اور جمالیاتی بصیرت کی بدولت ممتاز ہوتی ہے۔ حضور گرامی مولانا جلال الدین رومی اور ڈاکٹر علامہ محمد اقبال وہ دو ایسے شاعری کے دھرا ہیں جنہوں نے انسانِ کامل، خودی، عشق الٰہی اور وجود کی گہرائیوں پر ایسی روشنی ڈالی ہے کہ ان کے افکار زمان و مکان کی حدود سے ماورا ہو کر آج بھی ایک عالمی معنوی ورثہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اقبال اور رومی کا رشتہ اُردو اور فارسی تنقید میں عموماً ایک سادہ، خطی بیانیے کے تحت پیش کیا جاتا رہا ہے یعنی رومی بطور مرشد اور اقبال بطور مرید۔ اس زاویہ نظر نے بلاشبہ اقبال کے اعترافِ رومی کو نمایاں کیا، مگر اس نتیجے میں اقبال کی تخلیقی خود مختاری اکثر پس منظر میں چلی گئی۔ حالانکہ اقبال کا فکری سفر محض صوفیانہ روایت کی توسیع نہیں بلکہ اس روایت کی تنقیدی تشکیلِ نو ہے۔

یہ مضمون اس غالب بیانیے سے انحراف کرتے ہوئے یہ سوال اٹھاتا ہے کہ:

کیا اقبال واقعی رومی کے افکار کے محض شارح ہے یا وہ رومی کے ساتھ ایک تخلیقی اور فکری مکالمہ قائم کرتا ہے؟

اقبال خود رومی کو "پیر و مرشد" کہہ کر پکارتے ہیں مگر یہ نسبت اندھی تقلید کی نہیں بلکہ ایک ایسے روحانی ربط کی ہے جس میں سوال، اختلاف، اور نئی معنویت کی تشکیل شامل ہے۔ جاوید نامہ میں رومی کی بطور راہبر موجودگی دراصل اقبال کے فکری اعتماد کی علامت ہے، نہ کی انحصار کی۔ رومی یہاں ایک زندہ فکری قوت ہیں۔ ایک ایسا مکالمہ ساز وجود جو اقبال کے سوالات کو مہمیز دیتا ہے، نہ کہ ان پر قدغن لگاتا ہے۔

اقبال کے نزدیک رومی کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ رومی نے عشق کو محض جذباتی واردات نہیں بلکہ وجودی آگہی کا سرچشمہ بنایا۔ تاہم اقبال اسی عشق کو آگے بڑھا کر اسے خودی کی تعمیر، انسانی اختیار اور تاریخی عمل سے جوڑ دیتے ہیں۔ یوں رومی کا عشق، اقبال کے ہاں ایک نئے فکری افق میں داخل ہو جاتا ہے۔

یہاں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ اقبال کی خودی، رومی کی وحدتِ وجود کی نفی نہیں بلکہ اس کے تخلیقی تعبیر ہے۔ رومی جہاں انسان کو کائناتی وحدت میں تحلیل ہوتے دیکھتے ہیں وہیں اقبال اس وحدت کے اندر انسان کو ایک ذمہ دار، مختار اور فعال وجود کے طور پر دریافت کرتے ہیں۔ یہی فرق اس مضمون کا بنیادی محور ہے۔

یہ مقالہ اقبال اور رومی کے مابین تعلق کو تین سطحوں پر دیکھتا ہے: فکری سطح، تخلیقی سطح اور تنقیدی سطح۔ یوں یہ مضمون نہ تو محض تقابلی مطالعہ ہے اور نہ اثرات کی فہرست، بلکہ ایک ایسا تخلیقی و تنقیدی بیانیہ ہے جو رومی اور اقبال کو ایک زندہ فکری رشتے میں جوڑتا ہے، ایسا رشتہ جو آج کے قاری کے لیے بھی معنویت رکھتا ہے۔

مولانا جلال الدین رومی کے ہاں عشق محض ایک جذبہ یا صوفیانہ کیفیت نہیں بلکہ وجود کو سمجھنے کا ایک طریقِ کار ہے۔ رومی عشق کو نہ صرف انسان کے داخلی دنیا کا محرک مانتے ہیں بلکہ اسے کائنات کی تخلیقی قوت بھی برقرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک عشق وہ واحد راستہ ہے جو انسان کو اس کی اصل حقیقت یعنی خدا سے ربط کا شعور عطا کرتا ہے۔

رومی کے ہاں عشق کا آغاز عقل کی نفی سے نہیں بلکہ اس کی حد بندی سے ہوتا ہے۔ عقل جو ظاہری ترتیب اور منطق کے قائل ہے، وجود کی گہرائیوں میں اترنے سے قاصر رہتی ہے جبکہ عشق انسان کو باطن کی دنیا میں داخل ہونے کی اجازت دیتا ہے:

عشق از اول چرا خونی بود
تا گریز د ہر کہ بیرونی بود(۱)

عشق ازل سے ہی ہنگامہ خیز رہا ہے کیونکہ یہ ہر اس شے کو رد کر دیتا ہے جو باطن سے باہر، سطحی اور غیر حقیقی ہو۔ عشق کی فطرت یہ ہے کہ وہ انسان کو اس کے ظاہری خول سے نکال کر اصل حقیقت کی طرف لے جائے۔ یہاں عشق ایک Puritying force ہے۔ یعنی وجود کو غیر ضروری تہوں سے پاک کرنے والا عمل۔ یہی تصور آگے چل کر اقبال کے ہاں خودی کو تطہیر میں تبدیل ہوتا ہے۔

رومی کی مشہور تمثیل "نی" دراصل انسانی وجود کا استعارہ ہے۔ ایک ایسا وجود جو اپنے اصل (خدا) سے جدا ہو چکا ہے اور اب واپسی کی تڑپ رکھتا ہے:

بشنو از نی چون حکایت می کند
وز جدایی ھا شکایت می کند(۲)

نی کی آواز انسان کی روح کی فریاد ہے جو اپنے منبع سے جدائی کا شکوہ کرتی ہے۔ یہ دراصل انسانی وجود کا وہ

اضطراب ہے جو اسے سکون نہیں لینے دیتا۔ یہ اضطراب اقبال کے ہاں "احساس خودی" کی ابتدائی صورت اختیار کرتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ رومی اس اضطراب کو فنا کی طرف لے جاتے ہیں، جبکہ اقبال اسی اضطراب کو عمل اور تشکیلِ ذات کا زریعہ بناتے ہیں۔

رومی کی وحدتِ وجود کو اکثر غلط طور پر "انسان کی نفی" سمجھ لیا جاتا ہے، حالانکہ رومی کے نزدیک یہ نفی نہیں بلکہ اعلیٰ سطح کی آگہی ہے۔ انسان اپنی انانیت کو ترک کرتا ہے، مگر وجود کو نہیں:

چوں ز خود رستی، ھمہ بر تو رسد
چوں تو گم گشتی، ھمہ پیدا شود(۳)

جب انسان خود پرستی سے نجات پالیتا ہے تو کائنات کی معنویت اس پر آشکار ہونے لگتی ہے۔ خود کو کھو دینا دراصل حقیقت کو پالینا ہے۔ یہاں خود کو "کھونا" دراصل نفس امارہ کی نفی ہے، وجود کی نہیں۔ یہی نکتہ اقبال کو رومی کے قریب بھی کرتا ہے اور ان سے جدا بھی۔ اقبال نفس کی نفی کے بعد خودی کی تعمیر پر زور دیتے ہیں۔

رومی کے نزدیک انسان کامل وہ ہے جو عشق کے زریعے اپنی زات کے حدوں سے نکل کر کائناتی شعور حاصل کرلے۔ ایسا انسان نہ تقدیر سے شاقی ہوتا ہے، نہ زمانے سے خائف، کیونکہ وہ خود کو خدا کے منصوبے کا حصہ سمجھتا ہے۔ یہ تصور بظاہر اقبال کے "خودی" کے تصور سے مختلف دکھائی دیتا ہے، مگر دراصل یہی وہ مقام ہے جہاں سے اقبال اپنی فکری پرواز کا آغاز کرتے ہیں۔ اقبال رومی کے انسانِ عارف کو ایک قدم آگے لے جاکر انسانِ خلاق میں تبدیل کرتے ہیں۔

یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ اگر رومی عشق کو وجودی بیداری بناتے ہیں تو اقبال اسی بیداری کو تاریخی اور سماجی شعور میں ڈھال دیتے ہیں۔ رومی کا عشق انسان کو "ہونے" کا شعور دیتا ہے، جبکہ اقبال اسی شعور کو "بننے" کی طاقت عطا کرتے ہیں۔

یہی نقطہ اس مضمون کے مرکزی دعوے کو تقویت دیتا ہے کہ اقبال رومی کے مقلد نہیں بلکہ ان کے ہم سخن (Creative Interlocutor) ہیں۔

اگر رومی عشق کا وجودی آگہی کا دروازہ بناتے ہیں تو اقبال اسی دروازے سے داخل ہو کر انسان کو اپنی تقدیر کا شریک کار بنا دیتے ہیں۔ اقبال کے فلسفہ خودی کو محض انا کے مغربی تصور کے ساتھ خلط ملط کرنا ایک سنگین فطری غلطی ہے۔ اقبال کی خودی دراصل ایک روحانی، اخلاقی اور تخلیقی حقیقت ہے جو عشق الٰہی سے نمو پاتی ہے اور عمل کے ذریعے اپنی تکمیل کو پہنچتی ہے۔ اقبال کے فکر کا بنیادہ نقطہ یہ ہے کہ انسان اپنی ذات کو پہچان کر اسے مضبوط

بنائے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے، بتا تیری رضا کیا ہے (۴)

انسان جب اپنی خودی کو اخلاقی، روحانی اور فکری سطح پر بلند کر لیتا ہے تو وہ محض تقدیر کا پابند نہیں رہتا بلکہ تقدیر کی تشکیل میں شریک ہو جاتا ہے۔ اقبال کا یہ شعر رومی کے تصورِ فنا کے مقابلے میں ایک مختلف مگر متضاد نہیں، بلکہ توسیعی تصویر پیش کرتا ہے۔ یہاں فنا کا مطلب ذات کی نفی نہیں بلکہ اس کی تطہیر ہے۔

یہ ایک عام مغالطہ ہے کہ اقبال کی خودی عقل پرست اور رومی کا عشق جذبہ پرست ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال کے ہاں خودی کی اصل توانائی بھی عشق ہی ہے۔

عقل عیار ہے، سو بھیس بنا لیتی ہے
عشق بیچارہ نہ مُلا ہے نہ زاہد نہ حکیم (۵)

عقل چالاک ہے اور ہر صورت میں خود کو درست ثابت کر لیتی ہے، جبکہ عشق اپنی سچائی میں بے ساختہ اور غیر مصلحت پسند ہوتا ہے۔ یہی عشق رومی کے ہاں "فاعل"۔ فرق صرف سمت کا ہے، منبع ایک ہی ہے۔

رومی کے ہاں فنا کے بعد بقا ایک روحانی کیفیت ہے، مگر اقبال کے ہاں یہ بقا تاریخی اور سماجی کردار اختیار کر لیتی ہے۔

فنا فی اللہ مقامِ کمال نہیں
یہ ہے اصل مقامِ خودی، بقا فی اللہ (۶)

اقبال کے نزدیک خدا میں فنا ہو جانا آخری منزل نہیں، اصل منزل یہ ہے کہ انسان خدا سے وابستہ ہو کر اپنی خودی کو باقی رکھے۔ اس شعر میں اقبال صوفیانہ روایت سے انحراف نہیں کرتے بلکہ اسے نئی فکری سمت دیتے ہیں۔ ایسی سمت جو انسانی ذمہ داری اور تخلیقی عمل کو مرکز میں رکھتی ہے۔

اقبال کے نزدیک انسان محض کائنات کا حصہ نہیں بلکہ اس کا شریک تخلیق ہے۔ یہی تصور انہیں جدید وجودی فکر کے قریب بھی لے جاتا ہے، مفر مذہبی بنیاد کے ساتھ۔

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دما دم صدائے کُن فیکون (۷)

کائنات ایک جاری عمل ہے، جامد حقیقت نہیں۔ انسان اس عمل میں حصہ لے کر اپنی خودی کو معنی دیتا ہے۔ یہ تصور رومی کی کائناتی ہم آہنگی کو تاریخی حرکت میں بدل دیتا ہے۔ یہاں ہم واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں کہ رومی عشق کے ذریعے انسان کو اس کی اصل یاد دلاتے ہیں اور اقبال اسی یاد کو عمل میں بدل دیتے ہیں۔ یوں خودی، عشق کی ضد نہیں بلکہ اس کی اعلیٰ صورت بن جاتی ہے۔

اُردو تنقید میں عموماً رومی اور اقبال کو دو متضاد فکری قطبین کے طور پر پیش کیا گیا ہے؛

رومی: فنا، عشق، جذب اور وحدت

اقبال: خودی، عمل، اختیار اور بقا

یہ تقسیم بظاہر سہل ہے، مگر فطری طور پر سطحی۔ درحقیقت عشق اور خودی ایک دوسرے کی ضد نہیں بلکہ ایک ہی روحانی و وجود سفر کے دو مرحلے ہیں۔ رومی اس سفر کا باطنی دروازہ کھولتے ہیں اور اقبال اس دروازے سے گزرنے کے بعد انسان کو دنیا میں ذمہ دار وجود کے طور پر متعین کرتے ہیں۔

یہ سمجھنا کہ رومی کے ہاں عشق خودی کو ختم کر دیتا ہے، رومی کی فکر کو غلط پڑھنے کے مترادف ہے۔ رومی جس "خود" کو مٹاتے ہیں وہ دراصل نفسِ محدود ہے، نہ کہ وجودی مرکز۔ رومی کا شعر ہے کہ:

عشق آن شعلہ ست کاندر جان فتاد
ہر چہ جز معشوق، باقی جملہ سوخت (۸)

عشق وہ شعلہ ہے جو جب جان میں اترتا ہے تو محبوب حقیقی کے سوا ہر غیر ضروری شے کو جلا دیتا ہے۔ یہاں جلنا وجود کی نفی نہیں بلکہ تطہیر ہے۔ عشق خودی کو مٹا نہیں رہا بلکہ اسے غیر ضروری اضافات سے پاک کر رہا ہے۔ اقبال واضح طور پر کہتے ہیں کہ خودی عقل یا ارادے سے نہیں بلکہ عشق سے بیدار ہوتی ہے۔ اقبااس حوالے سے فرماتے ہیں:

عشق کی ایک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسمان کو بے کراں سمجھا تھا میں (۹)

عشق کی ایک ہی حرکت انسان کو محدود کائنات کے فریب سے نکال کر لامحدود حقیقت سے روشناس کرا دیتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اقبال رومی کے سب سے قریب نظر آتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ اقبال اس انکشاف کو حرکت، عمل اور تعمیرِ ذات میں بدل دیتے ہیں۔

رومی کے ہاں فنا ایک حتمی منزل نہیں بلکہ عبوری کیفیت ہے۔ اس طرح اقبال کے ہاں جامد حالت نہیں

بلکہ مسلسل جدوجہد ہے۔ رومی لکھتے ہیں:

مُردم از حیوانی و آدم شدم
پس چی ترسم؟ کی ز مردن کم شدم(۱۰)

اس شعر میں بتاتے ہیں کہ میں حیوانی سطح سے مرا، پھر انسان بنا، پھر اس سے آگے بڑھا، تو مجھے موت سے خوف کیوں ہو؟ یہ ارتقائی تصور اقبال کے فلسفہ خودی کا پیز خیمہ معلوم ہوتا ہے، جہاں ذات مسلسل بننے کے عمل میں رہتی ہے۔

اقبال فنا کو سماجی و اخلاقی معنویت دیتے ہیں اور کہتے ہیں:

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری
کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری(۱۱)

روحانیت اگر عمل اور سماجی ذمہ داری سے خالی ہو تو محض انفرادیت کا غم بن کر رہ جاتی ہے۔ یہ شعر دراصل رومی کی روحانیت کی نفی نہیں بلکہ اس کی اصلاح ہے۔ اقبال روحانیت کو تاریخ میں داخل کرنا چاہتے ہیں۔ یہاں ہم ایک نہایت اہم نکتے پر پہنچتے ہیں کہ رومی کا عشق اور اقبال کی خودی مل کر انسانِ کامل کا تصور مکمل کرتے ہیں۔ یعنی عشق شعورِ ذات اور خودی تشکیلِ ذات۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال "جاوید نامہ" میں رومی کو اپنا راہ نما بناتے ہیں، کیونکہ رومی عشق کی آگ دیتے ہیں اور اقبال اس آگ سے چراغِ عمل روشن کرتے ہیں۔

رومی اور اقبال کی فکر کا اصل ہدف انسان ہے مگر وہ انسان جو محض حیاتیاتی وجود نہیں بلکہ روحانی، اخلاقی اور کائناتی ذمہ داری کا حامل ہو۔ دونوں مفکرین کے ہاں "انسانی کامل" کا تصور مرکزی حیثیت رکھتا ہے، تاہم اس تصور کی تعبیر، سمت اور عملی نتائج مختلف ہیں۔ یہی فرق اس مضمون کے تخلیقی مکالمے کو بامعنی بناتا ہے۔

رومی کے نزدیک انسانِ کامل وہ ہے جو اپنے نفس کے حجاب چاک کر کے حقیقتِ مطلقہ سے ہم آہنگ ہو جائے۔ ایسا انسان "جاننے والا" ہوتا ہے، نہ کہ "غالب آنے والا" انسان کی اصل حقیقت اس کی ظاہری گفتگو میں نہیں بلکہ اس کے باطن میں پوشیدہ ہے۔ زبان محض پردہ ہے، اصل دروازہ روح ہے۔ مولانا رومی کا شعر ہے کہ:

آدمی مخفی است در زیر زبان
این زبان پردہ است بر درگاہ جان(۱۲)

یہاں رومی انسان کو ظاہری شناختوں (قوم، کردار اور منصب) سے آزاد کر کے ایک باطنی حقیقت کے طور پر دیکھتے ہیں۔ انسانِ کامل وہ ہے جو اس حقیقت تک رسائی حاصل کر لے۔ رومی کے انسانِ کامل میں

خاموشی، انکسار اور تسلیم بنیادی اوصاف ہیں۔ عشق کو لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں، جب عشق خود سامنے آتا ہے تو تمام وضاحتیں شرمندہ ہو جاتی ہیں۔ اس حوالے سے رومی لکھتے ہیں:

ھر چہ گویم عشق را شرح و بیان
چون بہ عشق آیم خجل گردم از آن (۱۳)

یہ خاموشی کمزوری نہیں بلکہ اعلیٰ شعور کی علامت ہے، ایک ایسا شعور جو لفظوں سے آگے جا چکا ہو۔ اقبال رومی کے عارف انسان کو تاریخ کے میدان میں لے آتے ہیں۔ ان کے نزدیک انسانِ کامل وہ ہے جو جاننے کے ساتھ کرنے والا بھی ہو۔ اور جو اخلاقی اقدار کو اپنی ذات میں جذب کر کے اجتماعی قیادت کا فریضہ انجام دے۔ اقبال کا شعر ہے کہ:

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا (۱۴)

یہاں انسان محض روحانی نجات کا طالب نہیں بلکہ دنیا میں اخلاقی نظم قائم کرنے والا کردار بن جاتا ہے۔ رومی کی انسانِ کامل کی خاموشی اقبال کے ہاں گفتار اور کردار میں ڈھل جاتی ہے۔ اصل میں وجود اصل میں ہونا نہیں بلکہ تخلیق اور حرکت ہے اور یہی خودی کی اصل پہچان ہے۔ اس حوالے سے اقبال کہتے ہیں:

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اس کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں (۱۵)

(یہاں ''وجود'' بطور تخلیقی قوت استعمال ہوا ہے) اقبال انسانِ کامل کو ایک تخلیقی قوت کے طور پر دیکھتے ہیں جو کائنات کے رنگ کو گہرا کرتا ہے۔ رومی کے ہاں انسان کائنات کے ساتھ ہم نوا ہو جاتا ہے اور اقبال کے ہاں انسان کائنات کے ساتھ شریک کار بن جاتا ہے۔ یہ فرق نہ تضاد ہے، نہ انکار بلکہ ارتقائی تسلسل ہے۔

رومی کی فکر کا ایک بنیادی ستون وحدتِ وجود ہے یعنی یہ تصور کہ کائنات میں حقیقی وجود صرف ایک ہے اور باقی سب اس کی تجلیات ہیں۔ اُردو تنقید میں اکثر یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ آیا اقبال اس نظریہ کے حامی ہیں یا مخالف۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال نہ تو وحدت وجود کے سادہ انکاری ہیں اور نہ اس کے روایتی مبلغ، بلکہ وہ اسے اخلاقی، وجودی اور تاریخی سطح پر دوبارہ تشکیل دیتے ہیں۔

رومی کے نزدیک وحدتِ وجود کوئی فلسفیانہ قضیہ نہیں بلکہ روحانی مشاہدہ ہے اور یہ دنیا پہاڑ کی مانند ہے اور ہمارے اعمال آواز کی طرح۔ جو کچھ ہم کرتے ہیں، وہی پلٹ کر ہمارے پاس آتا ہے۔ اس حوالے سے رومی کا ایک

شعر ہے:

این جہان کوہ است و فعل ما ندا
سوی ما آید نداھا را صدا(۱۶)

یہ شعر وحدتِ وجود کو اخلاقی سطح پر بھی بامعنی بنا دیتا ہے۔ انسان اور کائنات الگ نہیں، انسان کا عمل پوری کائنات میں گونجتا ہے۔ اور وحدتِ وجود کا مطلب خارجی حقیقتوں کا انکار نہیں بلکہ باطنی آنکھ کا کھل جانا ہے۔ جب باطنی آنکھ کھل جاتی ہے تو پوری کائنات ایک وحدت میں دکھائی دیتی ہے، پھر دوئی باقی نہیں رہتی۔ اسی حوالے سے مولانا رومی اپنے ایک شعر میں کہتے ہیں:

چشم چون بگشادہ شد، دیدی جہان
چون جہان دیدی، نماند این و آن(۱۷)

یہ وحدت ادراک کی وحدت ہے، مادی دنیا کی نفی نہیں۔ اقبال کا بنیادی اعتراض وحدتِ وجود پر نہیں بلکہ اس کے غیر فعال فہم پر ہے۔ اقبال کے نزدیک اگر وحدتِ وجود انسان کو تاریخی ذمہ داری سے آزاد کر دے تو وہ خطرناک بن جاتی ہے۔ اقبال اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ صوفیانہ وحدت نے بعض اوقات اخلاقی و سماجی امتیازات کو دھندلا دیا جو عملی زندگی کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس حوالے سے اقبال اپنے ایک شعر میں کہتے ہیں:

فقیہانِ حرم کے امتیازِ کفر و دیں
یہی مسلہ ہے جو صوفی نے حل کیا(۱۸)

یہ تنقید رومی پر نہیں بلکہ وحدتِ وجود کی جامد تشریحات پر ہے۔ اسی طرح اقبال وحدت کو عملی اور اخلاقی وحدت میں بدل دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ:

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوال کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ(۱۹)

اقبال کے نزدیک وحدت انسانوں کی باہمی ذمہ داری اور اجتماعی عمل میں ظہور کرتی ہے۔ اس شعر میں وحدتِ وجود، وحدتِ مقصد میں تبدیل ہو جاتی ہیں جو رومی کے روحانی مشاہدے کی تاریخی تعبیر ہے۔ یہ کہنا زیادہ

درست ہو گا کہ رومی وحدتِ وجود کو محسوس کرتے ہیں اور اقبال وحدتِ وجود کو برتاؤ میں لاتے ہیں۔ رومی کے ہاں وحدت ایک داخلی کیفیت ہے اور اقبال کے ہاں وہ اخلاقی مطالبہ بن جاتی ہے۔

اقبال کو عام طور پر "مرید رومی" کہا جاتا ہے، مگر یہ تعبیر اقبال کے فکری قد کاٹھ کو محدود کر دیتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال رومی کو پڑھتے نہیں، برتتے ہیں۔ وہ رومی کے متن کو اپنے عہد، اپنے سوالات اور اپنے تاریخی شعور از سر نو تخلیق کرتے ہیں۔ یہی عمل اقبال کو محض شارح نہیں بلکہ Creative reader بناتا ہے۔

جاوید نامہ محض ایک مثنوی نہیں بلکہ اقبال کا فکری خود نوشت نامہ ہے۔ اس میں رومی بطور راہنما موجود ہیں مگر یہ راہنمائی حکم دینے والا نہیں بلکہ سوال پیدا کرنے والی ہے۔ اقبال اس حوالے سے اپنے ایک شعر میں کہتے ہیں:

پیر رومی خاک را اکسیر کرد

از غبارم جلوہ تقدیر کرد(۲۰)

اس شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ رومی نے میرے وجودِ خاکی کو ایسی بصیرت دی کہ میں نے اپنی تقدیر کو پہچان لیا۔ یہ اعتراف تابع داری نہیں بلکہ فکری بیداری کا اظہار ہے۔ اقبال رومی سے روشنی لیتے ہیں، راستہ خود بناتے ہیں۔ جاوید نامہ میں رومی ایک علامتی وجود ہیں۔ روحانی روایت، عشق اور باطنی حکمت کی علامت۔ مگر اقبال اس علامت کو جامد نہیں رکھتے۔ وہ خود کہتے ہیں کہ اگرچہ میرا دل رومی کے عشق سے آگاہ ہے، مگر میرا فکری راستہ الگ ہے۔ اپنے کلام میں اس حوالے سے کہتے ہیں:

گرچہ مرا دل ز عشق او آگاہ است

لیکن میرا مقام دگر راہ است(۲۱)

یہاں اختلاف ادب کے ساتھ ہے۔ اقبال رومی سے جدا ہو کر بھی ان کے اندر رہتے ہیں۔ اقبال کے ہاں اختلاف بغاوت نہیں بلکہ وفاداری کی اعلیٰ شکل ہے۔ اگر وہ رومی کو من و عن دہرا دیتے تو خودی کا فلسفہ کبھی وجود میں نہ آتا۔ اقبال کہتے ہیں:

تقلید سے ناکارہ نہ کر اپنی خودی کو

کر اس کی حفاظت کہ یہ گوہر ہے یگانہ(۲۲)

اقبال تقلید کو فکری موت سمجھتے ہیں، حتیٰ کہ مرشد کے معاملے میں بھی۔ یہی نقطہ اقبال کو رومی کا سچا وارث بناتا ہے، کیونکہ رومی خود تقلید کے سخت مخالف تھے۔

آج کے عالمی اور سماجی حالات میں انسان شدید تفریق، تنہائی اور اخلاقی الجھن کا شکار ہے۔ رومی کا عشق اور اقبال کی خودی اس بحران میں معنوی اور تخلیقی رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔ رومی کا عشق ایک ایسا داخلی محرک ہے جو انسان کو اپنی محدود خودی سے نکال کر حقیقت مطلقہ سے روشناس کراتا ہے اور اقبال وہی داخلی بیداری عملی، تخلیقی اور تاریخی ذمہ داری میں بدل جاتی ہے۔

داخلی شعور اور خودی کی بیداری فرد کو ذہنی دباؤ اور اضطراب سے نجات دلاتی ہے۔ عملی خودی اور اخلاقی شعور انسانی معاشرت میں مثبت تبدیلی پیدا کرتے ہیں، جیسے سماجی انصاف، تخلیقی کام اور اخلاقی قیادت۔

رومی کا وحدتِ وجود ایک داخلی، روحانی تجربہ ہے، جو انسان اور کائنات کو ہم آہنگ کرتا ہے اور اقبال وحدت کو عملی اور اخلاقی شعور میں بدل کر تاریخی اور سماجی ذمہ داری بناتا ہے۔ یہ تصور عالمی سطح پر انسانیت کی اخلاقی ہم آہنگی کی مثال بن سکتا ہے۔ مختلف ثقافتوں، قوموں اور مذاہب کے درمیان تعلقات میں افہام و تفہیم پیدا کرتا ہے۔

رومی کے انسانِ کامل کو عارف اور اقبال کے انسانِ کامل کو فعال سمجھیں تو آج کے دور میں یہ روحانی بیداری، تخلیقی شعور، اخلاقی اور سماجی ذمہ داری میں مربوط ہو کر مکمل انسانی فطرت کے لیے ایک عملی نقشہ فراہم کرتے ہیں۔ اقبال نے رومی کو صرف نقل نہیں کیا، بلکہ Creative reader کی حیثیت سے اس کا فکری تسلسل جاری رکھا۔ یہ نقطہ آج بھی ادبی تحقیق اور فلسفیانہ مطالعہ کے لیے رہنما ہے۔ اس سے ہر قاری اپنا فکری مکالمہ پیدا کر سکتا ہے۔ روایتی متن کو تاریخی اور عملی سیاق میں ڈالا جا سکتا ہے۔ اور تخلیقی قرات نصوص کو زندہ اور متحرک رکھتی ہے۔

مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ رومی اور اقبال کا فکری سفر ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ عشق اور خودی ایک دوسرے کی ضد نہیں بلکہ تکمیل ہیں۔ انسان کا مقصد صرف ذات کی معرفت نہیں بلکہ تخلیقی عمل اور تاریخی ذمہ داری بھی ہے۔ روحانی آگہی، اخلاقی شعور اور تخلیقی عمل ایک ساتھ چل کر انسانِ کامل کی تشکیل کرتے ہیں۔ معاصر دنیا میں یہ فکر فرد اور معاشرے دونوں کے لیے رہنمائی فراہم کر سکتی ہے، خواہ وہ ذہنی سکون ہو، سماجی انصاف ہو یا تخلیقی خود اظہار۔

حوالہ جات

۱۔ جلال الدین رومی، مثنوی: مترجم، رینالڈ اے نکلسن، لندن: کیمبرج یونیورسٹی، اشاعت ۱۹۲۵ء، طبع اول، ص ۳۵

۲۔ ایضاً

۳۔ جلال الدین رومی، مثنوی: مترجم، رینالڈ اے نکلسن، لندن: کیمبرج یونیورسٹی، اشاعت ۱۹۲۶ء، طبع دوم، ص ۱۱۲

۴۔ محمد اقبال، اسرارِ خودی، لاہور: اقبال اکیڈمی، ۲۰۰۶ء، ص ۲۱

۵۔ محمد اقبال، بال جبریل، لاہور: اقبال اکیڈمی، ۲۰۰۶ء، ص ۶۷

۶۔ محمد اقبال، اسرار خودی، لاہور: اقبال اکیڈمی، ۲۰۰۶ء، ص ۴۷

۷۔ محمد اقبال، بال جبریل، ص ۱۲۴

۸۔ جلال الدین رومی، مثنوی: مترجم، رینالڈ اے نکلسن، ص ۱۱۲

۹۔ محمد اقبال، بال جبریل، ص ۹۱

۱۰۔ جلال الدین رومی، مثنوی: مترجم، رینا لڈ اے نکلسن، لندن: کیمبرج یونیورسٹی، اشاعت ۱۹۲۷ء، طبع سوم، ص ۳۹۰

۱۱۔ محمد اقبال، ضربِ کلیم، لاہور: اقبال اکیڈمی، ۲۰۰۶ء، ص ۵۸

۱۲۔ جلال الدین رومی، مثنوی: مترجم، رینالڈ اے نکلسن، طبع اول، ص ۳۵

۱۳۔ جلال الدین رومی، مثنوی: مترجم، رینالڈ اے نکلسن، طبع سوم، ص ۹

۱۴۔ محمد اقبال، بال جبریل، ص ۱۳۸

۱۵۔ محمد اقبال، بانگِ درا، ص ۵۲

۱۶۔ جلال الدین رومی، مثنوی: مترجم، رینالڈ اے نکلسن، طبع دوم، ص ۶

۱۷۔ جلال الدین رومی، مثنوی: مترجم، رینالڈ اے نکلسن، طبع سوم، ص ۲۱۴

۱۸۔ محمد اقبال، بالِ جبریل، ص ۶۳

۱۹۔ محمد اقبال، ضرب کلیم، ص ۲۹

۲۰۔ محمد اقبال، جاوید نامہ، ص ۲۳

۲۱۔ محمد اقبال، جاوید نامہ، ص ۴۱

۲۲۔ محمد اقبال، بال جبریل، ص ۵۸